رالف رسل

شادم از زندگئ خو یش

۱ اکتوبر ۱۹۸۱ کو میں نے SOAS سے رٹائرمنٹ لے لیا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ رٹائرمنٹ لے کر ہی آپ کو اپنی آپ بیتی یا اپنے reminiscences لکھنے چاہئیں۔ میں اِس کا قائل نہیں۔ میرے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں کہ آپ رٹائرمنٹ کے بعد ہی اپنے تجربوں کے بارے میں ٹھنڈے دل سے سوچ سکتے ہیں اور صحیح نتیجے نکال سکتے ہیں۔ لیکن بہرحال رٹئرمنٹ سے پہلے میں اس قسم کی چیز لکھنے کے لیے وقت نہیں نکال سکا، ورنہ اب پچاس سال ہونے کو آئے ہیں کہ مجھے اردو میں لکھنے کا خیال آیا تھا، بلکہ اردو میں لکھنے کا ارادہ بھی کر لیا تھا۔

SOAS میں لکچرر مقرّر ہونے کے فوراً بعد میں تعلیمی رخصت (study leave) لے کر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پہنچا۔ وہاں میری ملاقات اختر انصاری سے ہوئی، جو اُس زمانے میں یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر تھے۔ رشید احمد صدیقی اس زمانے میں صدرِ شعبہ تھے۔ انھوں نے اختر انصاری سے میری مدد کرنے کو کہا۔ قدرتی طور پر میں اُن کی بعض تصانیف سے روشناس ہو گیا۔ ان میں سے ایک کتاب تھی ''ایک ادبی ڈائری،'' جو لاہور سے ۱۹٤٤ میں شائع ہوئی تھی۔ اس میں انھوں نے مختلف مصنّفوں کے بارے میں اور مختلف واقعات کے بارے میں جن کی کوئی نہ کوئی ادبی اہمیت ہوتی تھی اپنے وہ خیالات قلمبند کیے تھے جو وقتاً فوقتاً ان کے ذہن میں آئے تھے۔ اس وقت سے آج تک میں سوچتا رہا کہ میں بھی اس قسم کی کتاب لکھ سکتا ہوں جو شاید اردو والوں کے لیے دلچسپی سے خالی نہ ہو۔ سالہا سال دوسری مصروفیتیں حائل ہو تی رہیں، لیکن آج لکھنا شروع کررہا ہوں۔

تمہید کے طور پر

یہ کتاب اصل میں ایک طرح سے ایک ضمیمہ ہے — میری اور میری شاگرد اور دوست Marion Molteno کی بعض انگریزی تحریروں کا ضمیمہ۔ میرین کے دو مضامین شائع ہوے، ایک امریکی رسالے (Annual of Urdu Studies (No. 6 میں اور دوسرا Urdu and Muslim

South Asia نامی اُس festschrift میں جو میرے اعزاز میں مرتّب ہوئی اور ۱۹۸۹ میں شائع ہوئی۔ پہلے مضمون کا عنوان تھا "Ralph Russell: Teacher, Scholar, Lover of Urdu" اور دوسرے کا "'This New Work': Ralph Russell and Urdu in Britain" ۔ اس کے بعد میرا اپنا مضمون "Urdu and I" ، Annual of Studies (No. 11) میں چھپا۔ مگر پھر بھی یہ کتاب جو آپ کے سامنے ہے ضمیمہ ہی سہی مگر ان تحریروں سے ذرا مختلف ہے جن کا آپ اسے ضمیمہ کہہ سکتے ہیں۔ اس میں میں نے اختر انصاری کی کتاب کے نمونے پر وہ خیالات قلمبند کیے ہیں وقتاً فوقتاً میرے ذہن میں آئے ہیں اور جن کا تعلّق کسی نہ کسی طرح اردو زبان اور ادب سے ہے۔

لیکن آگے بڑھنے سے پہلے میں اس کتاب کی زبان کے بارے میں کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ اردو میری مادری زبان نہیں ہے۔ اس کے باوجود میں اردو میں لکھ رہا ہوں، اور کوشش کر رہا ہوں کہ زبان سلیس بھی ہو اور بامحاورہ بھی۔ میں اپنے بہت پرانے اور بہت اچھے دوست خالد حسن قادری کا نہایت ممنون ہوں کی انھوں نے میری اردو کی نوک پلک درست کرنے کی زحمت اُٹھائی ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہوا کہ اب اس کتاب کی اردو وہ عمدہ اردو ہے جو قادری صاحب خود لکھتے ہیں اور، ظاہر ہے، میں نہیں لکھ سکتا۔ زبان میری ہی ہے اور قادری صاحب نے میرے کہنے پر صرف اتنا کیا ہے کہ اس سے گرامر (صرف و نحو) اور تجنیس وغیرہ کی غلطیاں دور کی ہیں۔

جو زبان میں لکھتا ہوں اس کے متعلّق چند اور باتیں بتانا چاہتا ہوں۔ میری زبان کی کچھ خصوصیتیں ہیں۔ پہلی خصوصیت یہ ہے کہ آپ اس میں کوئی تکلّف نہیں پائیں گے۔ تحریر اردو میں ہو یا انگریزی میں، جہاں تک ممکن ہو وہی زبان لکھنا پسند کرتا ہوں جو میں بولتا ہوں۔ اور میں کبھی پُر تکلّف قسم کی زبان بولنا پسند نہیں کرتا۔

مجھے اچّھی طرح معلوم ہے کہ جب میں اردو بولتا ہوں تو بعض لوگ سُنتے ہیں اور دل میں کہتے ہیں کہ ''اس شخص کو بس معمولی سی اردو آتی ہے۔'' اس کی بڑی وجہ وہی ہے جو میں نے ابھی بیان کی ہے، کہ میں کبھی پُر تکلّف قسم کی زبان نہیں بولتا۔ مثال کے طور پر میری زبان میں لوگ ''فرماتے'' نہیں ہیں، ''کہتے'' ہیں۔ اور میں ''عرض'' نہیں کرتا، میں بھی ''کہتا'' ہوں۔ اسی طرح لوگ ''تشریف'' نہیں لاتے، ''آتے'' ہیں، اور میں بھی ''آتا'' ہی ہوں، ''حاضر'' نہیں ہوتا۔ اس میں — خدا نخواستہ — کسی قسم کی بے ادبی

مقصود نہیں۔ (اگر میں کسی سے ’’تشریف لائیے‘‘ نہ کہوں، ’’آئیے‘‘ کہوں تو اس میں کوئی بے ادبی نہیں۔) اور یہ بھی بات نہیں ہے کہ میں ان الفاظ سے اور ان کے مصرف سے واقف نہیں ہوں۔ واقف تو ہوں لیکن میرا جی نہیں چاہتا کہ میں انہیں استعمال کروں۔ مجھے یاد ہے کہ کچھ سال پہلے میں اسلام آباد میں تھا۔ جمیل الدین عالی نے ناشتے پر نظیر صدیقی کو بلایا تھا اور مجھ سے بھی آنے کو کہا۔ باتوں باتوں میں ایک صاحب کی تصنیف کا ذکر آیا اور عالی صاحب نے میری رائے پوچھی۔ میں نے تعریف تو کی تھی، لیکن اس پُر تکلّف طریقے سے نہیں جس کی توقّع عالی صاحب کر رہے تھے۔ اس پر وہ بولے، ’’واقعی آپ کو اردو نہیں آتی!‘‘ (عالی صاحب ہمیشہ سے میرا مذاق اُڑاتے ہیں اور یہ بات مجھے بہت پسند ہے۔) میں‌نے کہا، ’’نہیں بھائی، یہ مسئلہ زبان دانی کا نہیں، یہ ذاتی مزاج کا مسئلہ ہے۔ ‘‘ اور یہ واقعہ بھی ہے۔

حال ہی میں ایک نوجوان اخبار نویس اطہر فاروقی مجھ سے ملنے آئے۔ خواہش کی کہ میرا انٹرویو لیں۔ میں راضی ہوا تو ٹیپ رکارڈر نکال کے اس پر انٹر ویو کی رکارڈنگ کی۔ اس کے بعد کہا کہ ’’چھپوانے سے پہلے میں اس کا ٹائپ اسکرپٹ تیّار کر کے آپ کے پاس لاؤں گا۔ آپ کو پڑھ کے سُناؤں گا۔ جہاں آپ کوئی ترمیم کرنا چاہیں کر دیجیے۔‘‘ دو تین دن کے بعد وہ پھر آئے۔ سنانا شروع کیا تو ’’دیگر حضرات‘‘ کے الفاظ آئے۔ میں نے فوراً روکا اور کہا کہ’’مجھے کامل یقین ہے کہ میں نے ’دیگر حضرات‘ نہیں کہا۔ ’دوسرے لوگ‘ کہا ہو گا۔‘‘ کہنے لگے ’’مانا کہ آپ نے وہ الفاظ نہیں استعمال کیے ہوں گے، لیکن جب آپ لکھتے ہیں تو آپ بالکل وہ زبان تو نہیں لکھتے جو آپ بولتے ہیں۔‘‘ میں نے کہا، ’’یہ صحیح ہے کہ تقریر کی زبان اور تحریر کی زبان میں فرق ہے، لیکن اسلوبِ بیان میں زیادہ فرق نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے ان لوگوں کی زبان سے بڑی کوفت ہوتی ہے جو ’اس کے علاوہ‘ نہیں لکھیں گے، ’علاوہ از ایں‘ لکھیں گے۔ اسی طرح ’راقم الحروف‘ لکھنے کی مطلق کوئی ضرورت نہیں۔ ’راقم الحروف‘ کے معنی ہیں ’میں‘۔ اور ’میں‘ ہی لکھنا چاہیے۔ خیر اس وقت آپ سناتے جائیے۔ فی الحال میں صرف یہی دیکھوں گا کہ میرا مطلب آپ نے صحیح لکھا کہ نہیں۔ لیکن آپ ضروری ترمیم کرنے کے بعد مجھے مسودّہ بھیجیے۔ میں ’دیگر حضرات‘ وغیرہ کو بدل کر آپ کو واپس کردوں گا۔‘‘

ایک دفعہ مجھے شبہہ سا ہونے لگا کہ شاید ’’فرمانا‘‘ وغیرہ جیسے الفاظ نہ بولنا

بدتمیزی ہو۔ میں نے خورشید الاسلام سے پوچھا کہ ایسی زبان بولنے کی ضرورت ہے یا نہیں۔ کہا، ''نہیں۔ آدمیوں کی زبان بولنی چاہیے۔'' خیر یہ تو میں نہیں کہوں گا کہ تکلّف کی زبان ''آدمیوں کی زبان'' نہیں ہے۔ مگر پھر بھی یہ زبان مجھے پسند نہیں اور اس کتاب میں میں ''آدمیوں کی زبان'' ہی لکھوں گا۔

اور اب اپنی کہانی شروع کرتا ہوں۔ یہاں بہت زیادہ تفصیل میں جانا مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ اس لیے ایک مختصر بیان پر اکتفا کرتا ہوں۔ (اگر آپ کو مزید تفصیل چاہیے تو آپ کو ان انگریزی مضامین میں ملے گی جن کا ذکر اوپر آچکا ہے۔)

اکثر لوگوں کی زندگی میں بہت سے واقعات ''اتّفاقاتِ زمانہ'' کی ذیل میں آتے ہیں۔ میری زندگی میں بھی اردو سے میرا رشتہ ''اتّفاقاتِ زمانہ'' ہی میں سے ہے۔

میری جوانی کا زمانہ وہ زمانہ تھا جس میں دوسری عالمی جنگ کے بادل آسمان پر چھا رہے تھے۔ جب میری عمر پندرہ سال تھی، جرمنی میں وہ زبردست سیاسی انقلاب ہوا جس کی بنا پر ہٹلر کی حکومت قائم ہوئی۔ اُس وقت تو میرا سیاسی شعور نہ ہونے کے برابر تھا، لیکن حالات کے دباؤ نے جلد ہی وہ شعور پیدا کیا اور ۱۹۳٤ میں میں (اپنے بہت سے ہمعصروں کی طرح) کمیونسٹ ہو گیا۔ ہم کمیونسٹوں کا عقیدہ تھا کہ ہندوستانی جو مکمّل آزادی چاھتے ہیں، وہ حق بجانب ہیں اور انگریز کمیونسٹوں کا فرض ہے کہ ہندوستان کی تحریکِ آزادی کی ہر ممکن حمایت کریں۔

ویسے یہ دنیا بھر کے کمیونسٹوں کا فرض تھا، لیکن انگریز کمیونسٹ چونکہ اُس قوم کے افراد تھے جس نے ہندوستان کو محکوم بنا رکھا تھا اس لیے ان پر ایک خاص ذمّہ داری عائد ہوتی تھی۔ پھر بھی مجھے ہندوستان کے حالات کا کوئی قابلِ ذکر علم نہیں تھا۔ میرا علم اور میری دلچسپی اس وقت بڑھنے لگی جب میں کیمبرج یونیورسٹی گیا۔ وہاں بعض ہندوستانی کمیونسٹوں سے ملاقات ہوئی۔ ان سے میں نے بہت کچھ سیکھا۔ لیکن اس وقت میرے خواب و خیال میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ مجھے کبھی ہندوستان جانے کا اتّفاق ہوگا۔

میں ۱۹٤۰ تک کیمبرج میں طالبِ علم رہا۔ تین سال کا کورس تھا۔ آخری سال کے شروع ہونے سے ایک مہینہ پہلے دوسری عالمی جنگ چِھڑ گئی۔ کسی کو اندازہ نہیں ہوسکتا تھا کہ جنگ میں کتنے سال لگیں گے اور جیت کس کی ہوگی۔ مستقبل کے لیے کوئی

ٹھوس منصوبہ بنانا ناممکن تھا۔ میری عمر کے ہر انگریز کی طرح مجھے جبری بھرتی کے قانون کے مطابق فوج میں جانا پڑا۔ (اس سے مستثنیٰ صرف وہی لوگ تھے جو ایسے کام کررہے تھے جو جنگ کے لیے بالکل ضروری تھے۔) اسی فوجی نوکری کے سلسلے میں مجھے ہندوستان بھیجا گیا۔ میں مارچ ۱۹۴۲ میں ہندوستان پہنچا اور ساڑھے تین سال کے بعد اگست ۱۹۴۵ میں برطانیہ واپس جانے کے لیے روانہ ہوا۔

جب میں ہندوستان پہنچا میری عمر چوبیس سال تھی۔ میں سولہ سال کی عمر میں کمیونسٹ ہو گیا تھا۔ مجھے ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ رہنا تھا، انڈین آرمی میں۔ انڈین آرمی کی زبان اردو تھی۔ اگر میں اپنے سپاہیوں سے باتیں کرنا چاہتا تھا تو ظاہر تھا کہ مجھے اردو سیکھنے کی ضرورت تھی۔ لہٰذہ میں نے سیکھی اور جب تک میں ہندوستان میں رہا اردو میں آزادی (اور کمیونزم) کا درس دیتا رہا۔

برطانیہ واپس آنے کے بعد مجھے ایک سال اور فوج میں رہنا پڑا۔ انھیں دنوں مجھے ایک اشتہار دکھایا گیا جس میں لکھا تھا کہ اسکول آف اورینٹل اینڈ ایفریکن اسٹڈیز، یونیورسٹی آف لنڈن، اردو ادبیات کے مطالعہ کے لیے ایک اسٹوڈنٹ شپ [وظیفہ] دے رہا ہے۔ امیّدواروں کے لیے ضروری ہے کہ وہ برٹش یونیورسٹی کے گریجویٹ ہوں اور اردو میں بی۔ اے۔ آنرز کی ڈگری کے تین سال پڑھنے کے لیے تیّار ہوں۔ اس کے بعد ہوسکتا ہے کہ انھیں اردو میں لیکچرشپ کی پیشکش کی جائے۔ میں نے اس کے لیے درخواست دی اور انتخاب کر لیا گیا۔

جون ۱۹۴٦ میں، پورے چھ سال کے بعد، فوجی نوکری سے چھٹکارا مِلا۔ اکتوبر ۱۹۴٦ میں SOAS میں داخل ہوا۔ تین سال میں نے بڑی محنت سے اردو پڑھی (اور اس کے ساتھ، ضمنی مضمون کی حیثیت سے، سنسکرت)۔ امتحان میں مجھے فرسٹ کلاس ملا۔ اور اس کے فوراً بعد لکچرر مقرّر ہوا۔ ۱۹٦٤ میں مجھے ریڈر بنایا گیا۔ ۱۹۸۱ میں رٹائرمنٹ لے لیا۔ رٹائرمنٹ کے بعد بھی میں اردو کی خدمت کرنے کی کوشش کرتا رہا اور عمر بھر یہ کوشش جاری رہے گی۔

[مسلسل]